مطالعہ افکار مغرب
ہندوستانی تعلیم پہ
منٹ
لارڈ ٹامس بیبنگٹن میکالے
ترجمہ اور تعارف
محمد دیان جوہر
کتاب محل

ہندوستانی تعلیم پر

منٹ

لارڈ تھامس بیبنگٹن میکالے

ترجمہ: محمد دین جوہر

جیسا کہ کچھ حضرات کا نکتۂ نظر معلوم ہوتا ہے جو پبلک انسٹرکشن کمیٹی کا حصہ ہیں کہ اب تک وہ جس راستے پر چلتے رہے ہیں وہ برطانوی پارلیمان نے ۱۸۱۳ء میں سختی سے متعین کر دیا تھا اور اگر یہ نکتۂ نظر درست ہے تو اس راستے کی تبدیلی کے لیے ایک پارلیمانی ایکٹ کی ضرورت ہو گی۔ میں نے اس بات کو مناسب خیال کیا کہ میں ان مخالفانہ بیانات کی تیاری سے بھی الگ رہوں جو اب جائزے کے لیے ہمارے سامنے ہیں، اور یہ بھی کہ اس موضوع پر اپنی رائے کو اس وقت تک محفوظ رکھوں جب تک کہ یہ معاملہ کونسل آف انڈیا کے ممبر کی حیثیت سے میرے سامنے پیش ہو۔

مجھے تو ایسا دکھائی نہیں دیتا کہ مفہوم سازی کا کوئی بھی ہنر پارلیمان کے اس ایکٹ کو وہ معنی پہنا سکتا ہے جو اس کے ساتھ چپکایا گیا ہے۔ اس میں خاص زبانوں یا خاص علوم کی تعلیم کے بارے میں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ بس کچھ رقم "علوم و ادب (لٹریچر) کے احیا اور فروغ کے لیے، ہندوستان کے اہل علم دیسی افراد کی حوصلہ افزائی کے لیے، اور علوم سائنس کو برطانوی علاقہ جات کے باشندوں میں متعارف اور فروغ" کے لیے مختص کی گئی ہے۔ دلیل یہ دی جاتی ہے یا ایسے ہی سمجھ لیا گیا ہے کہ پارلیمنٹ "علوم و ادب (لٹریچر)" سے مراد صرف عربی یا سنسکرت ادب ہی لے سکتی ہے، اور یہ بھی کہ ممبران پارلیمنٹ نے "دیسی صاحب علم" کے باعزت لقب سے ایسا کوئی مقامی باشندہ مراد نہیں لیا ہے جو ملٹن کی شاعری، لاک کی مابعد الطبیعات یا نیوٹن کی طبیعات سے بھی واقف ہو۔ بلکہ اس نام سے انہوں نے ایسے لوگ مراد لیے ہیں جنھوں نے ہندوؤں کی مقدس کتابوں سے کیوسا گھاس کے سارے استعمالات ازبر کر لیے ہوں گے[1]،

1۔ یہ گھاس کی ایک قسم ہے جو ہندوؤں کی مذہبی تقریبات میں استعمال ہوتی ہے۔ یہاں محکوموں کے مذاہب پر طنز ہے۔

اور ساتھ ہی ان لوگوں کو خدا میں انجذاب کے سارے اسرار بھی معلوم ہوں گے۔ یہ کوئی تسلی بخش تعبیر معلوم نہیں ہوتی۔ ہم اس کے متوازی ایک اور معاملہ دیکھتے ہیں۔ فرض کیا مصر کا پاشا کچھ رقم، اور مصر ایک ایسا ملک ہے جو علم میں اقوامِ یورپ سے کبھی برتر تھا، "ادب کے احیا اور فروغ کے لیے اور مصر کے مقامی باشندوں کی حوصلہ افزائی" کے لیے مختص کرے، تو کیا اس سے کوئی یہ مراد لے گا کہ اس کی سلطنت کے نوجوان اب سالہا سال فراعنہ کی تصویری تحریروں کے مطالعے میں صرف کریں گے؟ اور اوسیرس دیوتا کی اسطور میں پوشیدہ تمام نظریات کا کھوج لگائیں گے؟ اور تمام ممکنہ درستی کے ساتھ وہ رسم معلوم کریں گے جو عہد قدیم میں بلیوں اور پیازوں کی تقدیس کے لیے ادا کی جاتی تھی؟ کیا اس پاشا پر تضاد کا الزام مناسب ہوگا اگر وہ اپنی نوجوان رعایا کو قدیمی ستونوں کی ہنر افشانی میں کھپانے کی بجائے انہیں انگریزی اور فرانسیسی کی تعلیم کا حکم دے، اور ساتھ ہی ان سب سائنسی علوم کا جن کی یہ زبانیں کلید اعظم ہیں؟

پرانے نظام کے حامی ممبران جن الفاظ پر تکیہ کیے ہوئے ہیں وہ ان کی مراد بہم نہیں پہنچاتے۔ پھر مزید ایسے لفظ بھی ہیں جو دوسرے فریق کے لیے فیصلہ کن ہیں۔ یاد رہے کہ مختص شدہ یہ ایک لاکھ روپے نہ صرف "ہندوستان میں علوم و ادب کے احیا" کے لیے ہیں، اور یہی وہ ترکیب ہے جس پر ان کی ساری تعبیر اٹھائی گئی ہے، بلکہ "برطانوی علاقہ جات کے باشندوں میں سائنسی علوم کے تعارف اور فروغ" کے لیے بھی ہیں، اور یہ ہی وہ لفظ ہیں جو اس تبدیلی کو جائز بنانے کے لیے کافی ہیں جس کا میں داعی ہوں۔

اگر کونسل ممبران میری اس مفہومی ساخت سے متفق ہیں تو کسی قانون ساز ایکٹ کی ضرورت نہیں پڑے گی اور اگر وہ مجھ سے اختلاف کرتے ہیں تو میں ایک مختصر سا ایکٹ تیار کر دیتا ہوں جو (ایسٹ انڈیا کمپنی کے) ۱۸۱۳ء کے چارٹر کی اس دفعہ کو منسوخ کر دے گا جس سے مشکل پیدا ہو رہی ہے۔

میں جس دلیل پر غور کر رہا ہوں وہ صرف کاروائی کی ہیئت پر اثرانداز ہوتی ہے۔ لیکن مشرقی نظامِ تعلیم کے حامی ممبران نے ایک دوسری دلیل استعمال کی ہے، اور جسے اگر درست مان لیں تو وہ ہر طرح کی تبدیلی کے خلاف فیصلہ کن ہو جاتی ہے۔ یہ ممبران تصور کرتے ہیں کہ عوامی اعتماد موجودہ نظام سے وابستہ ہے، اور ان رقوم کے استعمال میں، جو اب تک عربی اور سنسکرت کی تدریس پر صرف ہوئی ہیں، کوئی تبدیلی کھلے زیاں کی بات ہوگی۔ یہ بات سمجھنا آسان نہیں کہ دلیل سازی کا آخر وہ کون سا عمل ہے جس کے ذریعے یہ لوگ اس نتیجے پر پہنچے ہیں! عطیات جو عوامی خزانے سے علوم و ادب (لٹریچر) کی حوصلہ افزائی کے لیے دیے جاتے ہیں، وہ ایسے عطیات سے بالکل بھی مختلف نہیں ہوتے جو مفروضہ یا حقیقی فائدہ رکھنے والے دیگر کاموں کے لیے ہوتے ہیں۔ ہم کسی مقام پر سینے ٹوریم بناتے ہیں جس کی صحت افزائی فرض کر لی گئی ہوتی ہے۔ کیا ایسا کرنے سے ہم خود کو پابند بنا لیتے ہیں کہ سینے ٹوریم وہیں رہے گا، چاہے اس کے نتائج ہماری توقع کے مطابق نہ بھی

ہوں؟ فرض کیا ہم کسی مینار کی تعمیر شروع کر دیتے ہیں، اور ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اور کام روک دیتے ہیں، تو کیا ایسا کرنا مفاد عامہ کے خلاف ہو گا؟ حقوق ملکیت بلاشبہ مقدس ہیں۔ لیکن کوئی چیز ان کو خطرے میں نہیں ڈالتی جتنا یہ عمل، جو اب خاصا عام ہے، کہ انہیں ایسے امور سے منسوب کیا جائے جن سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اور جو ان خلاف ورزیوں کو بھی ملکیت جیسا تقدس عطا کرتے ہیں، وہ در حقیقت ملکیت کے ادارے پر ان خلاف ورزیوں کی ناپسندیدگی اور بوداپن تھوپ رہے ہیں۔ اگر حکومت نے کسی شخص کو کوئی رسمی یقین دہانی کروائی ہے، یا اگر حکومت نے کسی شخص کے ذہن میں کوئی معقول توقع ابھار دی ہے کہ اسے سنسکرت یا عربی کے استاد یا شاگرد کے طور پر ایک خاص رقم ملے گی، تو میں ایسے شخص کے معاشی مفادات کا احترام کروں گا۔ میں افراد سے فیاضانہ سلوک کے معاملے میں تو غلطی کر سکتا ہوں، لیکن مفاد عامہ پر حرف گیری کو برداشت نہیں کر سکتا۔ کسی حکومت کے بارے میں کہنا کہ وہ کچھ مخصوص زبانیں یا مخصوص علوم ہی پڑھائے گی، اگرچہ وہ زبانیں بیکار ہو چکی ہوں، مجھے تو بالکل ہی لغو دکھائی دیتا ہے۔ تعلیمات عامہ میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس سے یہ استنباط کیا جائے کہ ہندوستانی حکومت نے اس موضوع پر کبھی بھی کوئی اقرارنامہ دینے کا ارادہ کیا ہے یا کبھی یہ سوچا ہے کہ ان رقوم کا حتمی مقصد اس طرح طے ہوا ہے اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر ایسا ہوا بھی ہوتا، تو میں اپنے پیشرؤوں کی اس اہلیت کو مسترد کر دیتا کہ وہ اس موضوع پر ہمیں کسی عہد نامے سے پابند کر سکتے ہیں۔ فرض کیا گزشتہ صدی میں کوئی حکومت نہایت سنجیدگی سے یہ قانون پاس کرتی کہ رعایا کو ابد الآباد چیچک کے خلاف ٹیکے لگائے جائیں گے۔ تو کیا یہ حکومت جینیفر کی دریافت کے بعد بھی اپنے اس عمل پر بضد رہے گی؟ یہ وعدے ایسے ہیں جن کی ادائی کا کوئی دعویٰ نہیں کرتا، اور جن سے کوئی چھٹکارا بھی نہیں دلا سکتا۔ یہ مفوضہ حقوق ہیں جو کسی ایک کو تفویض بھی نہیں ہیں۔ یہ بغیر مالکان کے ملکیت ہے۔ یہ رہزنی، جو کسی کو غریب بھی نہیں کرتی، صرف ایسے لوگوں کی سمجھ میں آ سکتی ہے جو مجھ سے زیادہ صلاحیت کے مالک ہیں! اور میں اس دعوے کو محض الفاظ کا دروبست سمجھتا ہوں جس سے انگلستان اور ہندوستان میں ہر زیاں کاری کا دفاع کیا جاتا ہے جس کے لیے کوئی دوسرا دعویٰ قائم نہ ہو سکے۔

میرا پختہ خیال ہے کہ یہ ایک لاکھ روپے گورنر جنرل ان کونسل کی مکمل صوابدید پر ہیں، تاکہ یہ ہندوستان میں آموزش کے فروغ پر خرچ ہوں، جیسے وہ مناسب سمجھیں۔ میری یہ رائے بھی ہے کہ آنجناب ایسی ہدایات جاری کرنے میں بالکل خود مختار ہیں کہ یہ رقم اب عربی اور سنسکرت کی حوصلہ افزائی پر نہیں لگائی جا سکتی، بالکل ویسے ہی جیسے کہ وہ یہ حکم کرنے میں آزاد ہیں کہ میسور میں چیتے ہلاک کرنے کا انعام کم کر دیا جائے یا یہ کہ سرکاری رقوم بڑے گرجا گھر میں جہر خوانی پر خرچ نہیں ہوں گی۔

اب ہم معاملے کے لب لباب کی طرف آتے ہیں۔ ہمارے پاس ایک فنڈ ہے جسے سرکاری حکم کے

بموجب یہاں کے لوگوں کی عقلی بہتری پر صرف کیا جائے گا۔ سادہ سوال یہ ہے کہ اسے خرچ کرنے کا سب سے مفید طریقہ کیا ہے؟

سارے فریق ایک نکتے پر متفق دکھائی دیتے ہیں کہ ہندوستان کے اس حصے کے مقامی لوگ جو بولیاں استعمال کرتے ہیں ان میں کوئی ادبی اور سائنسی معلومات نہیں ہیں۔ مزید بر آں، وہ اتنی تنگ دامن اور ناشائستہ ہیں کہ جب تک انہیں کسی دوسرے ذریعے سے متونگر نہ کیا جائے، ان میں کسی اچھی تصنیف کا ترجمہ بھی آسان نہیں۔ فریقین کو یہ بھی تسلیم ہے کہ ایسے طبقات کی عقلی بہتری جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے وسائل رکھتے ہیں، اب صرف ایسی زبان کے ذریعے بروئے کار لائی جاسکتی ہے جو ان میں متداول نہیں ہے۔

تو پھر وہ زبان کون سی ہو گی؟ کمیٹی کے نصف ممبران کا موقف ہے کہ یہ انگریزی ہونی چاہیے اور باقی نصف ممبران عربی اور سنسکرت کی پر زور سفارش کرتے ہیں۔ میرے خیال میں پورا سوال یہی ہے کہ کون سی زبان اس قابل ہے کہ جانی جائے؟

مجھے سنسکرت اور عربی کا کوئی علم نہیں، لیکن ان کی قدر کا درست اندازہ لگانے کے لیے جو ضروری کام ہے وہ میں نے کیا ہوا ہے۔ میں نے مشہور عربی اور سنسکرت تصانیف کے تراجم پڑھے ہیں۔ میں نے یہاں اور اپنے وطن میں ایسے لوگوں سے گفتگو کی ہے جو مشرقی زبانوں پر امتیازی عبور رکھتے ہیں۔ میں بالکل تیار ہوں کہ خود مستشرقین نے مشرقی علوم کی جو قدر متعین کی ہے اسے فوراً تسلیم لوں۔ اور مجھے ان مستشرقین میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں ملا جو اس بات سے انکار کرے کہ کسی اچھی یورپی لائبریری کی ایک شیلف ہندوستان اور سارے عرب کے مقامی علوم وادب سے بڑھ کر ہے۔ مغربی علوم وادب کی خلقی برتری کمیٹی کے ان ممبران کو بھی تسلیم ہے جو تعلیم کے مشرقی منصوبے کی حمایت کرتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اس پہ کوئی نہیں بگڑے گا کہ شاعری ادب کا وہ شعبہ ہے جس میں مشرقی مصنفین زیادہ بلندی پر کھڑے ہیں۔ اور مجھے مستشرقین میں کوئی ایک آدمی بھی یقیناً ایسا نہیں ملا جو یہ مؤقف رکھنے کی جرأت کرے کہ عربی اور سنسکرت کی شاعری کا موازنہ یورپی اقوام کی شاعری سے کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جب ہم تصنیفاتِ تخیل سے آگے گزر کر ایسی تصنیفات کی طرف آتے ہیں جن میں حقائق کا اندراج ہوتا ہے اور عام سائنسی اصولوں کی تحقیق کی جاتی ہے، تو اہل یورپ کی برتری مطلقاً ناقابل پیمائش ہو جاتی ہے۔ ایسا کہنا یقیناً مبالغہ آرائی نہیں ہے کہ سنسکرت زبان میں لکھی گئی کتابوں سے جمع شدہ کل تاریخی معلومات ان معلومات سے بھی بیکار ہیں جو ان گھٹیا خلاصوں میں ہوتی ہیں جنہیں انگلستان کے ثانوی اسکولوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ طبعی اور اخلاقی فلسفے کے ہر شعبے میں دونوں قوموں کی باہمی حیثیت بھی بالکل ایسی ہی ہے۔

تو اب بتائیے کہ معاملے کی اٹھان کیا ہو گئی ہے؟ ہم نے ایک ایسی قوم کو تعلیم دینی ہے کہ جسے اس کی مادری زبان میں تعلیم نہیں دی جا سکتی! تو لابدی ہم انہیں کوئی غیر ملکی زبان ہی پڑھائیں گے۔ اور یہاں ہماری زبان کے دعاوی کا اعادہ بھی ضروری نہیں۔ یہ تو مغرب کی زبانوں میں بھی گل سر سبد ہے۔ اس میں متخیلہ کی ایسی کثیر تصانیف ہیں جو یونان کے شاہکاروں سے کسی طور کم نہیں اور جو ہمیں ورثے میں ملے ہیں، یعنی بلاغت کی ہر نوع کے نمونے موجود، تاریخی تحریریں بھی فراہم، اور اگر ہم انہیں محض بیانیے کے طور پر بھی دیکھیں تو ان سے بڑھی ہوئی کوئی شے موجود نہیں، اور اگر ہم انہیں اخلاقی اور سیاسی آموزش ناموں کے طور پر دیکھیں تو کوئی چیز بھی ان کے برابر نہیں۔ پھر اس زبان میں انسانی زندگی اور انسانی فطرت کی تصویر کشی کے موزوں اور متحرک نمونے بھی حاضر۔ اور مابعد الطبیعات، اخلاقیات، حکومت و فرمانروائی، اصولِ قانون، اور تجارت پر عمیق ترین افکار بھی فراہم۔ اور ہر تجرباتی سائنس کی بھرپور اور درست معلومات بھی کثرت سے دستیاب، جو حفظان صحت، آسائش میں اضافے اور ذہانت انسانی میں توسیع کے لیے سازگار ہوتی ہیں۔ جو بھی یہ زبان (انگریزی) جانتا ہے، وہ اس فکری دولت تک رسائی پا لیتا ہے جسے کرۂ ارض کی دانا ترین اقوام نے نوے (۹۰) نسلوں میں تخلیق اور ذخیرہ کیا ہے۔ یہ بات بلاخوف کہی جا سکتی ہے کہ اس زبان میں فراہم شدہ علوم و ادب اب ان تمام علوم و ادب سے زیادہ قابل وقعت ہیں جو آج سے تین سو قبل دنیا کی تمام زبانوں میں فراہم تھے۔ بس یہی کافی نہیں۔ ہندوستان میں فرمانروا طبقے کی زبان بھی انگریزی ہے۔ دیسی لوگوں کے اعلیٰ طبقات جو حکومت میں رسوخ رکھتے ہیں، وہ بھی یہی زبان بولتے ہیں۔ اور اس بات کا بھی غالب امکان ہے کہ آئندہ انگریزی تمام بحورِ شرق کی تجارتی زبان بن جائے۔ یہ ان عظیم یورپی معاشروں کی بھی زبان ہے جو افریقہ کے جنوب میں، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں ابھر رہے ہیں، اور یہ وہ معاشرے ہیں جو ہر سال اہم تر ہو رہے ہیں، اور پھر یہ ہماری ہندوستانی امپائر سے بہت جڑے ہوئے بھی ہیں۔ بھلے ہم اپنے علوم و ادب کی خلقی وقعت کو سامنے رکھیں، بھلے اس ملک کی خاص حالت کو، ہمیں یہ باور کرنے کی قوی ترین دلیل مل جاتی ہے کہ دیگر تمام غیر ملکی زبانوں کے مقابلے میں انگریزی ہی وہ زبان ہے جو ہماری دیسی رعایا کے لیے سب سے زیادہ مفید رہے گی۔

اب ہمارے سامنے سوال محض یہی ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب یہ زبان پڑھانا ہماری طاقت میں ہے، آیا ہم ایسی زبانیں پڑھائیں جن میں عالمی اتفاق رائے سے کسی موضوع پر ایسی کتابیں ہی نہیں ہیں جو ہماری کتابوں سے لگا کھاتی ہوں؟ اور آیا ایسے وقت میں جب ہم یورپی سائنس پڑھا سکتے ہیں، ہم ایسے نظام پڑھائیں جو عالمگیر تسلیم رائے سے جب بھی یورپی نظاموں سے اختلاف کریں، بدتر ہی کرتے ہیں؟ اور آیا ایسے وقت میں جب ہم صحت مند فلسفہ اور سچی تاریخ پڑھا سکتے ہیں، ہم سرکاری خرچ پر ایسے

طبی نظریات پر صاد کریں جو ایک انگریز مُلّا کو بھی شرمسار کر دیں؟ اور آیا ایسی فلکیات پڑھائیں جو کسی اقامتی اسکول میں انگریز لڑکیوں کو قہقہوں پر مجبور کر دے، اور ایسی تاریخ جس میں پینتیس فٹ کے بادشاہ عام ہوں اور جن کا عہد حکومت تیس ہزار تک محیط ہو، اور ایسا جغرافیہ پڑھائیں جس میں مکھن اور بھات کے سمندر ٹھاٹھیں مارتے ہوں؟

ہمارا تجربہ بھی یہاں رہنمائی کرتا ہے۔ تاریخ ہمیں اس سے ملتے جلتے حالات سے باخبر کرتی ہے، اور وہ سب ہمیں ایک ہی سبق دیتے ہیں۔ ہم زیادہ دور نہیں جاتے، اسی جدید عہد میں دو یادگار مثالیں ہیں جن میں پورے معاشرے کے ذہن کو مہمیز ہوئی، یعنی تعصبات الٹائے گئے، علم نفوذ ہوئے، ذوق مطہر ہوئے، اور فنون اور سائنسی علوم نے ایسے ممالک میں جڑ پکڑی جو تھوڑا قبل تک اجڈ اور وحشی ہوا کرتے تھے۔

میری پہلی مثال کا تعلق پندرھویں صدی کے آخر اور سولہویں صدی کے شروع میں اقوام مغرب میں علوم و ادب کا زبردست احیا ہے۔ اُس وقت جو چیز بھی قابلِ مطالعہ تھی وہ صرف قدیم یونانیوں اور رومیوں کی تحریروں میں موجود تھی۔ اگر ہمارے آباؤ اجداد نے بھی وہی کچھ کیا ہوتا جو کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن اب تک کرتی رہی ہے، اگر انہوں نے سسیرو اور ٹیسی ٹس کی زبان کو نظر انداز کیا ہوتا، اگر انہوں نے اپنی توجہ کو ہمارے اپنے جزیرے کی قدیم بولیوں تک ہی محدود رکھا ہوتا، اگر انہوں نے جامعات میں اینگلو سیکسن تاریخی قصوں اور نارمن فرنچ داستانوں کے علاوہ کچھ چھاپا اور پڑھایا نہ ہوتا، تو کیا انگلستان وہ کچھ ہوتا جو اب ہے؟ یونانی اور لاطینی کی جو حیثیت مُور اور آسقم کے ہم عصروں کے لیے تھی، وہی حیثیت ہندوستان کے لوگوں کے لیے ہماری زبان کی ہے۔ انگلستان کے علوم و ادب اس وقت کلاسیکی اور قدیم عہد کے علوم و ادب سے زیادہ وقیع ہیں۔ مجھے تو اس میں بھی شبہ ہے کہ سنسکرت کے علوم و ادب کی وقعت ہمارے سیکسن اور نارمن پُرکھوں کے علوم و ادب جیسی ہے۔ کچھ شعبوں میں یعنی مثال کے طور پر تاریخ وغیرہ میں تو یہ یقیناً بہت گھٹیا ہیں۔

دوسری مثال تو ابھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ گزشتہ ایک سو بیس سال کے عرصے میں ایک قوم، جو اتنی ہی وحشی حالت میں تھی جتنے ہمارے آباؤ اجداد صلیبی جنگوں سے پہلے تھے، بتدریج اس جہالت سے باہر آئی ہے جس میں یہ ڈوبی ہوئی تھی۔ میری مراد روس سے ہے۔ اب اس ملک میں ایک وسیع تعلیم یافتہ طبقہ ہے، جس میں ایسے افراد کثرت سے ہیں جو ریاست میں اعلیٰ ترین فرائض کی بجاآوری کے اہل ہیں، اور وہ کسی صورت ان اہل کمال سے کم نہیں جو لندن اور پیرس کے حلقوں کو زینت بخشتے ہیں۔ لہٰذا ہم امید باندھ سکتے ہیں کہ وسیع روسی ایمپائر جو ہمارے داداؤں کے زمانے میں پنجاب سے پیچھے تھی، ہو سکتا ہے ہمارے پوتوں کے زمانے میں راہ ترقی پر فرانس اور برطانیہ کے شانہ

بشانہ ہو چلے۔ اور یہ تبدیلی کیسے عمل میں لائی گئی؟ نہ قومی تعصبات کی خوشامد سے؛ اور نہ ہی جوانانِ ماسکو کے ذہنوں کو بڑھیاؤں کی کہانیوں سے تھپکیاں دے کر، ایسی کہانیاں جنھیں وحشی والدین سچ مانتے تھے؛ اور نہ ہی ان کے ذہنوں میں سینٹ نکولس کے جھوٹے افسانے ٹھونس کر؛ اور نہ ہی ان کی حوصلہ افزائی سے کہ وہ اس عظیم سوال پر غور کریں کہ آیا دنیا تیرہ ستمبر کو بنائی گئی تھی یا نہیں بنائی گئی تھی؛ اور نہ ہی اس کو "صاحب علم مقامی آدمی" کے خطاب سے نواز کر جب اس نے ان علوم میں مہارت پیدا کر لی۔ بلکہ یہ تبدیلی غیر ملکی زبانیں پڑھا کر لائی گئی جن میں معلومات کے انبار لگا دیے گئے۔ یہ معلومات لوگوں کی رسائی میں دے کر یہ تبدیلی مؤثر بنائی گئی۔ مغربی یورپ کی زبانوں نے روس کو مہذب بنا دیا۔ مجھے اس میں شک نہیں کہ یہ زبانیں ہندو کے لیے بھی وہی کچھ کریں گی جو یہ تاتار کے لیے کر چکی ہیں۔

ہاں تو نظریہ اور تجربہ جس طرز عمل کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، اس کے خلاف دلائل کیا ہیں؟ کہا یہ جاتا ہے کہ ہمیں دیسی آبادی کا تعاون حاصل کرنا چاہیے، اور ایسا ہم صرف سنسکرت اور عربی پڑھا کے ہی کر سکتے ہیں۔

میں یہ بات کسی صورت تسلیم نہیں کر سکتا کہ جب ایک قوم جو بلند عقلی کارنامے دکھا چکی ہو اور اس کی ذمہ داری ایک نسبتاً جاہل قوم کو تعلیم دینے کی ہو، تو شاگرد اُس راستے کے تعین کا کوئی حق رکھتے ہیں جو استادوں نے اختیار کرنا ہے۔ تاہم اس موضوع پر کوئی بات کہنا ضروری ہی نہیں، کیونکہ یہ بات مسکِت شہادت سے ثابت ہو چکی ہے کہ ہم فی الحال دیسی لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوئی کوشش کر بھی نہیں رہے۔ ان کی عقلی صحت کی قیمت دے کر ان کے عقلی ذوق کو درخورِ اعتنا سمجھنا بہت ہی برا ہو گا۔ ہم ان دونوں میں کسی کو بھی خاطر میں نہیں لا رہے، بس ہم تو ان سے ایسی آموزش کو روکے ہوئے ہیں جس کے لیے ان کی جان ٹوٹ رہی ہے، اور ان کو زبردستی ایسی آموزش دے رہے ہیں جس سے ان کو گھن آتی ہے۔

یہ بات ثابت ہے کیونکہ ہم اپنے عربی اور سنسکرت کے طلبا کو تعلیم کے لیے پیسے دینے پر مجبور ہیں، جبکہ وہ طلبا جو انگریزی سیکھتے ہیں، ہمیں پیسے دینے پر تیار ہیں۔ دیسی لوگوں کے اپنی مقدس زبانوں کے احترام اور محبت پر دنیا بھر کی شعلہ بیانی اور تقریر بازی ایک غیر جانب دار شخص سے اس ناقابل تردید حقیقت کو اوجھل نہیں کر سکتی کہ ہم اپنی وسیع امپائر میں ایک بھی ایسا طالب علم نہیں پاتے جو ہم سے پیسے لیے بغیر عربی پڑھنے کے لیے تیار ہو۔

مدرسے کے ایک مہینے کا حساب کتاب اس وقت میرے سامنے ہے، جو دسمبر ۱۸۳۳ء کا مہینہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عربی کے طالب علم تعداد میں ستتر (۷۷) تھے۔ سب سرکاری وظیفے پر ہیں۔ فی مہینہ ان کو دی جانے والی کل رقم ۵۰۰ روپے سے زیادہ ہے۔ کھاتے کے دوسری جانب یہ شق درج ہے: منہائی رقم جو انگریزی کے غیر اقامتی (نہارگانہ) طلبا سے گزشتہ مئی جون اور جولائی میں وصول کی گئی: ۱۰۳ روپے۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ کوئی مقامی تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے مجھے ایسی باتوں پر حیرت ہوئی ہے، اور یہ بھی کہ ہندوستان میں اپنے خرچے پر پڑھنا یہاں کے طلبا کا رواج نہیں ہے۔ اس سے محض میری رائے ہی کی تصدیق ہوتی ہے۔ کوئی بات اس سے زیادہ یقینی نہیں ہے کہ دنیا میں کہیں بھی لوگوں کو کوئی ایسا کام کرنے کے لیے پیسے دینے پڑیں جسے وہ خوشگوار اور منافع بخش سمجھتے ہیں۔ اس اصول سے ہندوستان بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ جب بھوک لگی ہو تو چاول کھانے کے لیے، یا موسم سرما میں اونی کپڑے پہننے کے لیے ہندوستانیوں کو پیسے دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ زیرِ بحث معاملے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ بچے گاؤں کے سکول ماسٹر سے لکھنا پڑھنا اور کچھ ابتدائی حساب کتاب سیکھتے ہیں تو اس کے لیے انہیں کہیں سے پیسے تھوڑی ملتے ہیں، بلکہ بچوں کو تدریس کی تنخواہ ملتی ہے۔ تو پھر لوگوں کو سنسکرت پڑھانے کے لیے پیسے دینے آخر کیوں ضروری ہیں؟ بظاہر اسی لیے کہ سب جانتے ہیں کہ سنسکرت اور عربی ایسی زبانیں ہیں کہ جن کا علم (یعنی ان پر دستگاہی) اس قابل بھی نہیں کرتا کہ انہیں سیکھنے کی تکلیف کی تلافی ہی کر دے۔ اس طرح کے سارے موضوعات و معاملات پر مارکیٹ ہی ایک فیصلہ کن ٹیسٹ کے طور پر لاگو ہو جاتی ہے۔

اگر ضرورت سمجھی جائے تو دوسری طرح کی شہادت بھی مل جاتی ہے۔ گزشتہ سال سنسکرت کالج کے پرانے طلبا نے کمیٹی کے سامنے ایک عرضداشت پیش کی۔ درخواست دہندگان نے کہا کہ انہوں نے کالج میں دس بارہ سال تعلیم پائی، اور ہندو ادب اور ہندو سائنس میں مہارت حاصل کی، اور یہ کہ انہیں مہارت کی اسناد بھی جاری کی گئیں۔ لیکن اس پوری کاوش کا حاصل وصول کیا ہوا؟ انہوں نے بیان کیا کہ ”اسنادِ مہارت کے باوجود، ہم کمیٹی والا جناب کی اعانت کے بغیر اپنی (معاشی) حالت کو بہتر بنانے کا کوئی امکان نہیں پاتے، اور ہمارے اہل وطن جو عمومی لاتعلقی ہم سے ظاہر کرتے ہیں، اس سے یہ امید نہیں بندھتی کہ وہ ہماری کوئی مدد کریں گے“۔ اصل میں یہ درخواست گزار ہم سے التماس کر رہے ہیں کہ ہم گورنر جنرل سے ان کی سفارش کریں کہ انہیں سرکار میں کہیں کھپایا جائے، ایسے عہدوں پر نہیں جو باعزت والے ہیں یا جہاں تنخواہ زیادہ ملتی ہے، محض ایسی نوکریاں جہاں انہیں قُوت لایموت میسر ہو جائے۔ وہ کہتے ہیں ”ہمارا مطالبہ باعزت روزگار کا ہے، اور ایسا روزگار جس میں بتدریج بہتری ہوتی رہے، اور یہ ہمیں سرکار کی مدد کے بغیر نہیں مل سکتا، کیونکہ سرکار ہی نے بچپن سے لے کر اب تک ہماری تعلیم اور کفالت کی ہے“۔ وہ نہایت ذلت بھرے انداز میں اس عرض گزاری پر اپنی بات ختم کرتے ہیں کہ سرکار نے دورانِ تعلیم جو فیاضانہ سلوک ان سے روا رکھا اس سے انہیں قوی یقین حاصل ہو گیا ہے کہ سرکار بعدِ تعلیم ان کو بیکاری اور غربت کے سپرد نہیں کرے گی۔

میں تلافی و امداد کے لیے حکومت کو دی جانے عرضیوں کو دیکھنے کا عادی ہوں۔ ایسی سب عرضیاں،

بھلے وہ کتنی ہی نا معقول کیوں نہ ہوں، اپنی بات اس مفروضے سے اٹھاتی ہیں کہ کوئی بڑا نقصان ہو گیا ہے یا یہ کہ کوئی زیادتی ہو گئی ہے۔ اور یہ تو یقیناً ایسے پہلے عرضی گزار ہیں، اور ان کی کوئی نظیر بھی نہیں، کہ جو مفت تعلیم دیے جانے پر تلافی اور امداد کے متقاضی ہیں، یعنی جن کو بارہ سال تک سرکار کے خرچ پر پالا گیا، اور سائنس وادب سے آراستہ کر کے انہیں اس دنیا میں روانہ کیا گیا۔ وہ اپنی تعلیم کو یوں پیش کر رہے ہیں کہ ان کے ساتھ کچھ بڑی زیادتی ہو گئی ہے، اور اسی سے انہیں سرکار پر اپنے تلافی مافات کے دعوے کا جواز ملتا ہے۔ ان کے خیال میں یہ ایک ایسی زیادتی ہے جس کے لحاظ سے دورانِ تعلیم ان کا وظیفہ بہت کم تھا۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ درست کہتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے بہترین سال ایک ایسی چیز سیکھنے میں ضائع کر دیے جو ان کے لیے نہ ذریعۂ معاش ثابت ہوئی اور نہ ذریعۂ عزت۔ ہم اپنی سرکاری حیثیت میں اِن افراد کو ناکارہ اور بد حال بنانے پر اٹھنے والی لاگت سے یقیناً بچ سکتے تھے، اور بالیقین (اگر ہم نے یہی کرنا تھا تو) اس سے خاصی کم سرکاری لاگت پر ہم انسانوں کو تیار کر سکتے تھے جو حکومت پر بوجھ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی معاشرت میں ذلت کا نشان بھی ہوں۔ ہماری پالیسی یہی تو رہی ہے۔ ہم تو حق اور باطل کی نبرد آزمائی میں غیر جانبدار ہونے پر بھی قانع نہیں۔ ہم تو اس بات کو بھی پسند نہیں کرتے کہ دیسی لوگوں کو ان کے موروثی تعصبات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔ مشرق میں درست سائنس کی ترقی میں جو فطری رکاوٹیں ہیں، ان میں ہم اپنی ایجاد کردہ مشکلات کو بھی شامل کر رہے ہیں۔ سرکار کی معاشی نوازشیں اور عطیات، جو ہمارے خیال میں حق کے فروغ میں لگانا بھی جائز نہیں، ہم دروغ پروردہ ذوق اور باطل فلسفے پر نچھاور کر رہے ہیں۔

اس طرزِ عمل سے ہم بعینہٖ وہی برائی پیدا کرتے ہیں، جس سے ہم ڈرتے ہیں۔ ہم وہ مزاحمت و مخالفت خود پیدا کر رہے ہیں جو موجود نہیں۔ ہم سنسکرت اور عربی کالج پر جو رقم لگا رہے ہیں وہ نہ صرف مقاصدِ حق کا کھلا نقصان ہے بلکہ اس نوازشانہ رقم سے ہم غلط کاری کے اساطین پیدا کر رہے ہیں۔ اور یوں ایک مورچہ بن جاتا ہے جہاں صرف نوکری گیروں ہی کا ہجوم نہیں ہوتا، بلکہ ہیجان اور مفاد کی مہمیز پر چلنے والے کٹھ ملا بھی جمع ہو جاتے ہیں جو تعلیم کی ہر مفید اسکیم کے خلاف طوفان اٹھا دیتے ہیں۔ اگر مقامی لوگوں میں میری سفارش کردہ تبدیلی کی تجویز کے خلاف کوئی مخالفت پائی جاتی ہے تو یہ مخالفت ہمارے ہی نظام کا ثمر ہے۔ اس مخالفت کے رہنما ایسے اشخاص ہیں جو ہمارے وظائف پر پلتے رہے ہیں اور جنہیں ہم نے اپنے کالجوں میں تربیت دی ہے۔ ہم جتنی دیر اپنے موجودہ راستے پر گامزن رہیں گے، یہ مخالفت اتنی ہی ناقابلِ تسخیر ہوتی چلی جائے گی، اور ہر سال ہماری رقم سے تیار شدہ بھرتیوں کی تازہ کمک ان کو فراہم ہوتی رہے گی۔ اگر ہم اسے اپنے حال پر چھوڑ دیں تو ہمیں دیسی معاشرے سے کسی قسم کی دشواریوں کا اندیشہ نہیں۔ ساری چہ میگوئیاں اس استشراقی دلچسپی سے نکلیں گی جسے ہم نے مصنوعی طور پر خود ہی وجود

بخشا ہے اور جسے پال پوس کے قوت بخشی ہے۔

ایک واقعاتی بات اور بھی ہے، جو یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اگر انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو دیسی آبادی کے احساسات وہ نہیں ہوتے جو پرانے نظام کے حامی بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ کمیٹی ممبران نے ایک لاکھ سے زائد روپے عربی اور سنسکرت کی کتابیں چھاپنے کے لیے مختص کرنا مناسب سمجھا ہے۔ ان کتابوں کا کوئی خریدار نہیں۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ کوئی ایک کتاب ہی نکل جائے۔ تئیس ہزار جلدیں، جو زیادہ تر فولیو اور کوارٹو کی صورت میں ہیں، اس کمیٹی کی لائبریریوں بلکہ ذخیرہ خانوں میں بھری پڑی ہیں۔ اب تو کمیٹی ممبران کتابیں مفت بانٹ کے مشرقی علوم و ادب کے اس وسیع ذخیرے سے جان چھڑانے کی کوشش میں ہیں۔ لیکن وہ اتنی جلدی خلاصی نہیں پاتے جتنی تیزی سے وہ چھپ کے آجاتی ہیں۔ اس ذخیرے میں ڈھیروں تازہ ردی کاغذ شامل کرنے کے لیے ہر سال تقریباً بیس ہزار روپے خرچ کیے جاتے ہیں، جو میرے خیال میں پہلے ہی کافی ہیں۔ پچھلے تین سالوں میں تقریباً ساٹھ ہزار روپے اسی طرح خرچ کیے گیے ہیں۔ ان سالوں میں سنسکرت اور عربی کتابوں کی بکری ایک ہزار روپے کے برابر بھی نہیں ہوئی۔ اور اسی عرصے میں اسکول بک سوسائٹی سات، آٹھ ہزار کتابیں ہر سال فروخت کرتی ہے، جس سے نہ صرف طباعت کا خرچہ نکل آتا ہے بلکہ اس رقم پر ۲۰ / فیصد منافع بھی کماتی ہے۔

اس حقیقت پر بہت زور دیا گیا ہے کہ ہندو قانون زیادہ تر سنسکرت کتابوں سے سیکھا جائے گا اور محمدن قانون عربی کتابوں سے، لیکن اس کا ہمارے موجودہ سوال سے تو ہرگز کوئی تعلق ہی نہیں۔ ہمیں تو پارلیمنٹ نے یہ حکم نامہ جاری کیا ہے کہ ہم ہندوستان کے قوانین کا پتہ چلائیں اور پھر ان کا ایک خلاصہ تیار کریں۔ ہمیں ایک لا کمیشن کا تعاون اور رہنمائی اسی لیے فراہم کی گئی ہے۔ جونہی یہ قانونی ضابطہ نافذ العمل ہوگا، منصف اور صدر امین کے لیے ساشتر اور ہدایہ بے کار ہو جائیں گی۔ مجھے اس بات پر بھروسہ ہے کہ مدرسے اور سنسکرت کالج میں اس وقت داخل ہونے والے طلبا کے فارغ التحصیل ہونے سے پہلے ہی یہ عظیم کام مکمل ہو جائے گا۔ یہ بات بداہتاً لغو ہوگی کہ نئی نسل کو ایک ایسی صورت حال کے لیے تعلیم دی جائے جسے ان کے بلوغ تک پہنچنے سے پہلے ہی ہم تبدیل کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

ایک دلیل اور ہے جو بالکل ہی ناقابل دفاع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سنسکرت اور عربی ایسی زبانیں ہیں جن میں دس کروڑ لوگوں کی مقدس کتابیں لکھی ہوئی ہیں، اور خاص الخاص حوصلہ افزائی ان کا حق بنتا ہے۔ یقیناً، ہندوستان میں برطانوی حکومت کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف روادار رہے، بلکہ مذہبی معاملات میں بالکل غیر جانبداری کا مظاہرہ کرے۔ لیکن ایسے علوم و ادب میں تعلیم کی حوصلہ افزائی کرنا جو خلقی طور پر تسلیماً بے وقعت ہیں، ایک ایسی پالیسی ہے جو عقل کے مطابق ہے نہ اخلاقیات کے۔ یہ اس مقدس غیر جانبداری

کے بھی خلاف ہے جس کی پاسداری پر ہم سب متفق ہیں۔ اس پالیسی کا جواز اس لیے بھی ختم ہو جاتا ہے کہ یہ (دیسی) علوم و ادب انتہائی اہم موضوعات پر انتہائی سنگین غلطیاں طلبا کے ذہنوں میں راسخ کر دیتے ہیں۔ اس بات کا بھی اعتراف کیا جاتا ہے کہ کسی زبان کی کوکھ مفید علوم سے تو خالی ہو، لیکن اس کی تدریس اس لیے ضروری ہے کہ یہ عفریتی توہمات میں ثمر آور ہے۔ ہم جھوٹی تاریخ، جھوٹی فلکیات، جھوٹی طب اس لیے پڑھانے پر مجبور ہیں کہ یہ سب ایک جھوٹے مذہب کے ساتھ ہمیں ملی ہیں۔ ہم احتراز کرتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی احتراز کریں گے کہ ہم ان لوگوں کی سرکاری حوصلہ افزائی کریں جو دیسی لوگوں کو عیسائی بنا رہے ہیں۔ ایسے وقت جب ہم یہ سب کچھ کر رہے ہیں، تو کیا یہ کوئی معقول اور مہذب بات ہو گی کہ ہم سرکاری آمدنی سے ایسے لوگوں کو رشوت پیش کریں جو اپنی جوانی اس کام میں ضائع کر دیں کہ گدھے کو ہاتھ لگانے کے بعد کیسے پاک ہوا جاتا ہے، اور ویدا کا کون سا متن دہرایا جائے گا تاکہ ایک بکری کی جان لینے کے گناہ کا کفارہ ہو جائے؟

علوم شرقیہ کے حمایتی اس عام خیال کے دلدادہ ہیں کہ کوئی دیسی باشندہ انگریزی میں شدبد سے آگے نہیں جا سکتا۔ وہ اسے ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتے، لیکن بین السطور کہے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنے مخالفین کی مجوزہ تعلیم کو جیے رٹے کی تعلیم کا لقب دیتے ہیں۔ وہ اپنے اس مفروضے کو ناقابل تردید سمجھتے ہیں کہ اصل سوال ایک طرف ہندو اور عربی علوم کی گہری تعلیم، اور دوسری طرف سطحی انگریزی علوم کے قاعدے سیکھنے کے درمیان فیصلے کا ہے۔ یہ نہ صرف ایک مفروضہ ہے، بلکہ ایسا مفروضہ جو کل عقل اور سارے تجربے کے خلاف ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مختلف قوموں کے غیر ملکی ہماری زبان اتنی سیکھ لیتے ہیں کہ اس کے ادق علوم تک بھی رسائی پا لیتے ہیں، اور ہمارے محاوراتی زبان لکھنے والے مصنفین کی نازک خیالی سے بخوبی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اسی شہر میں ایسے دیسی باشندے موجود ہیں جو سیاسی یا سائنسی مسائل پر روانی اور عین باریکی سے انگریزی زبان میں گفتگو پر کامل عبور رکھتے ہیں۔ میں نے دیسی صاحبوں کو یہی سوال، جسے میں ابھی رقم کر رہا ہوں، ایسی ذہانت اور دلدادگی سے زیر بحث لاتے ہوئے سنا ہے جو پبلک انسٹرکشن کمیٹی کے ممبران کو بھی زیر بار کر دے۔ بلاشبہ، براعظم یورپ کے ادبی حلقوں میں بھی ایسے غیر ملکی کو ڈھونڈنا کارے دارد ہے جو انگریزی زبان میں درست اور رواں اظہار پر اتنی قدرت رکھتا ہو جو مجھے یہاں بہت سے ہندوؤں میں نظر آئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی یہ دعویٰ نہیں کرے گا کہ انگریزی ایک ہندو کے لیے اتنی ہی مشکل ہے جتنی یونانی ایک انگریز کے لیے ہے۔ ایک ذہین انگریز نوجوان اس سے کہیں کم سالوں میں یونانی پڑھنے، اس سے لطف اندوز ہونے، اور یونانی مصنفین کے انداز میں بخوشی انشا کے قابل ہو جاتا ہے، جتنے سال ہمارے بدنصیب طلبا سنسکرت کالج میں گزارتے ہیں۔ جتنے وقت میں

ایک انگریز نوجوان ہیروڈوٹس اور سوفوکلیز کو پڑھنے کے قابل ہوتا ہے، اس سے نصف وقت میں ایک ہندو ہیوم اور ملٹن کو پڑھنے کے قابل ہو جائے گا۔

میں نے جو کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ: میرے خیال میں ۱۸۱۳ء کا پارلیمانی ایکٹ ہمارے پاؤں کی زنجیر نہیں؛ یہ کہ کوئی واضح یا ڈھکا چھپا وعدہ ہمارے پاؤں کی زنجیر نہیں؛ یہ کہ ہم جس طرح چاہیں اپنے فنڈ خرچ کرنے میں آزاد ہیں؛ یہ کہ ہمیں وہ فنڈ ایسی چیز کی تعلیم پر صرف کرنے ہیں جو سکھائے جانے کے قابل ہے؛ یہ کہ انگریزی ہی سنسکرت اور عربی کے مقابلے میں اس قابل ہے کہ سیکھی جائے؛ یہ کہ مقامی لوگ اس بات کے آرزومند ہیں کہ انہیں انگریزی سکھائی جائے اور اس بات کے متمنی نہیں ہیں کہ انہیں سنسکرت یا عربی پڑھائی جائے؛ یہ کہ قانون اور مذہب کی زبانوں کے طور پر سنسکرت اور عربی میں کوئی ایسی خاص بات نہیں کہ وہ ہماری حوصلہ افزائی کی سزاوار ٹھہریں؛ اور یہ کہ اس ملک کے دیسی باشندوں کو انگریزی میں پورے کے پورے اچھے شاگرد بنانا ممکن ہے۔ ہماری کوششوں کا رخ اسی مقصد کی طرف ہونا چاہیے۔

میں ایک نکتے پر ان حضرات سے متفق ہوں جن کے عمومی خیالات کی میں مخالفت کر رہا ہوں۔ ان کے ساتھ میں بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ اپنے محدود وسائل کے ساتھ جمہور عوام کو تعلیم دینے کی کوشش کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس وقت ہم پر لازم ہے کہ ایک ایسا طبقہ بنانے کی بھرپور کوشش کریں جو ہمارے اور ہماری کروڑوں عوام کے درمیان ترجمان بن سکے۔ یہ ایسے لوگوں کا طبقہ ہو جو نسل اور رنگ میں ہندوستانی ہوں، اور ذوق، عمومی سوچ، اخلاقیات اور اپنی عقل میں انگریز ہوں۔ ہم مقامی زبانوں کی بہتری کو بھی اسی طبقے کے سپرد کر سکتے ہیں، تاکہ وہ مغربی اسماء الاشیا سے سائنسی اصطلاحات مستعار لے کر اپنی بولیوں کو تونگر بنائیں، اور بتدریج انہیں آبادی کی عظیم اکثریت تک علم کی ترسیل کا مؤثر ذریعہ بنا دیں۔

موجودہ تمام مفادات کا میں شدت سے احترام کرتا ہوں۔ میں ان سب افراد کے ساتھ فیاضانہ سلوک کروں گا جو مالی امداد کی توقع رکھنے کا معقول جواز رکھتے ہیں۔ لیکن میں برے نظام کی جڑوں پر ضرب لگاؤں گا جسے اب تک ہم نے نشوونما دی ہے۔ میں چاہوں گا کہ عربی اور سنسکرت کتابوں کی طباعت فوری طور پر بند ہو۔ میں چاہوں گا کہ کلکتہ میں قائم مدرسہ اور سنسکرت کالج ختم ہو۔ بنارس برہمنی تعلیم کا ایک عظیم مرکز ہے اور دہلی عربی تعلیم کا۔ اگر ہم بنارس میں سنسکرت کالج اور دہلی میں محمدن کالج باقی رہنے دیں تو یہی کافی مہربانی ہے، بلکہ میرے خیال میں مشرقی زبانوں کے لیے کافی سے آگے، بے پایاں مہربانی ہے۔ اگر بنارس اور دہلی کالج باقی رکھنے ہی پڑیں تو میں کم از کم یہ سفارش ضرور کروں گا کہ اب کے بعد جو طلبا وہاں پڑھنے کے لیے جائیں انہیں ہرگز کوئی وظیفہ نہ دیا جائے۔ لوگوں کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے کہ ایسی چیز جو وہ نہیں سیکھنا چاہتے اسے سرکاری رشوت سے سیکھنے کی بجائے، دو مخالفانہ تعلیمی نظاموں کے درمیان

خود ہی فیصلہ کریں۔ اس طرح جو فنڈز ات ہمیں حاصل ہوں گے، اس سے ہم کلکتہ کے ہندو کالج کی زیادہ حوصلہ افزائی کر سکتے ہیں، اور فورٹ ولیم اور آگرہ پریزیڈنسیوں کے پورے علاقہ جات کے بڑے شہروں میں ایسے اسکول قائم کر سکیں گے جہاں انگریزی زبان بہت اچھے اور بھرپور طریقے پر پڑھائی جائے گی۔

اگر کونسل کے گرامی ممبران کا وہی فیصلہ ہوا جس کی مجھے توقع ہے، تو میں انتہائی جوش اور سرعت سے اپنے فرائض کی بجاآوری شروع کر دوں گا۔ دوسری طرف اگر حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ موجودہ نظام میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی، تو میری درخواست ہو گی کہ مجھے کمیٹی کی صدارت سے ریٹائر ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے، کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ ایسی صورت میں یہاں میری ذرہ بھر افادیت بھی نہیں ہو گی، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہاں رہ کر میں ایک ایسی چیز پر اپنی رضامندی کا اظہار کروں گا جسے میں یقیناً دیوانہ خیالی سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ موجودہ نظام سچ کی ترقی کو تیز گام نہیں کر رہا بلکہ دم توڑتی سنگین خطاؤں کی فطری موت کو مؤخر کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم اس وقت بورڈ آف پبلک انسٹرکشن کے باعزت نام کے اہل نہیں ہیں۔ ہم تو ایک ایسا بورڈ ہیں جو سرکاری پیسہ ضائع کر رہا ہے، ایسی کتابیں چھاپ کر جو طباعت سے پہلے اس خالی کاغذ سے بھی کم قدر ہیں جس پر وہ طبع ہوئی ہیں۔ اس طرح ہم لغو تاریخ، لغو مابعد الطبیعات، لغو طبیعات، لغو الٰہیات کی مصنوعی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں، اور ایسے طلبا کی ایک نسل تیار کر رہے ہیں جو اپنے علم کو ایک بوجھ اور کلنک کا ٹیکہ سمجھتے ہیں، اور جو دورانِ تعلیم بھی سرکاری پیسے پر پلتے ہیں، اور جن کی تعلیم ناکارۂ محض ہے، ایسی کہ فارغ التحصیل ہو کر یا تو وہ فاقوں مریں یا اپنی بقیہ ساری زندگی پھر سرکار ہی پر تکیہ کریں۔ ان خیالات کے ساتھ میں فطری طور پر اس بات کا خواہشمند ہوں کہ ایسی مجلس کی ذمہ داری میں کوئی بھی حصہ لینے سے انکار کر دوں جسے میں، اگر یہ اپنے طور طریقے نہیں بدلتی، صرف لاحاصل ہی نہیں سمجھتا، بلکہ واقعتاً مسموم و مضرت رساں خیال کرتا ہوں۔

٭٭

حوالہ جاتی نوٹ:

لارڈ میکالے کے منٹ[۲] کی علمی، تاریخی اور استعماری اہمیت کی وجہ سے اس کے مشمولات اور استناد کے

۲۔ کسی تنظیم، ادارے یا سرکاری محکمے کے باقاعدہ اجلاس میں زیر بحث آنے والے امور اور ان پر ہونے والے فیصلوں کا ریکارڈ رکھنے کے لیے اجلاس کی کاروائی نوٹ کر لی جاتی ہے، اور اس باضابطہ اندراج کو منٹ (minute) کہتے ہیں۔ منٹ کا اندراج اجلاس میں شریک کوئی ممبر وغیرہ کرتا ہے۔ برصغیر کی تقدیر بدل دینے والا یہ اجلاس ۲؍ فروری ۱۸۳۵ء کو منعقد ہوا جس کی صدارت لارڈ میکالے نے کی۔ استعماری صدیوں میں اس منٹ کی اہمیت از حد ہے، کیونکہ

بارے میں زبردست بحثیں پائی جاتی ہیں۔ کچھ محققین تو اس کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں اور کچھ دیگر اس کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ لارڈ میکالے کی "نیک نیتی" ثابت کر کے ہندوستانیوں پر اس کے احسانات گنوائے جا سکیں۔ اس منٹ کے اکثر ورژن جو عام طور پر دستیاب ہیں زیادہ تر الحاقی ہیں، اور ان میں اس طرح تبدیلی کی گئی ہے کہ یہ منٹ لارڈ میکالے کے لیے بہت زیادہ شرمناک بن گیا ہے، گویا یہ اصلی منٹ اس کے لیے کوئی بہت قابل فخر چیز ہو۔ ہم نے مستند ترین ذریعے سے حاصل ہونے والے منٹ کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اور ہمارا سورس مندرجہ ذیل ہے:

Postcolonialisms:AnAnthologyofCultural

TheoryandCriticism

Editedby:GauravDesaiandSupriyaNair

Publishedby:BERG,Oxford,2005

محولہ بالا کتاب ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی تھی اور اس کے مؤلف مدیران نے مندرجہ ذیل نوٹ بھی درج کیا ہے تاکہ اس منٹ کے سورس اور استناد کے بارے میں مزید معلومات فراہم ہو سکیں:

ThomasBabingtonMacaulay,

"MinuteonIndianEducation,February2,1835"

From*SelectedWritings,* Ed.JohnCliveandThomas

Pinney,pp237-251,Chicago,UniversityofChicago

Press,1972

***

اس نے ہماری مذہبی تعلیم پر بھی بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔

ta, and to establish in the principal cities throughout the Presidencies of Fort William and Agra schools in which the English language might be well and thoroughly taught.

If the description of this Lordship in Council should be such as I anticipate, I shall enter on the performance of my duties with the greatest zeal and alacrity. If, on the other hand, it be the opinion of the Government that the present system ought to remain unchanged, I beg that I may be permitted to retire from the chair of the committee. I feel that I could not be of the smallest use there—I feel, also, that I should be lending my countenance to what I firmly believe to be a mere delusion. I believe that the present system tends, not to accelerate the progress of truth, but to delay the natural death of expiring errors. I conceive that we have at present no right to the respectable name of a Board of Public Instruction. We are a Board for wasting public money, for printing books which are of less value than the paper on which they are printed was while it was blank; for giving artificial encouragement to absurd history, absurd metaphysics, absurd physics, absurd theology; for raising up a breed of scholars who find their scholarship an encumbrance and a blemish, who live on the public while they are receiving their education, and whose education is so utterly useless to them that, when they have received it, they must either starve or live on the public all the rest of their lives. Entertaining these opinions, I am naturally desirous to decline all share in the responsibility of a body which, unless it alters its whole mode of proceeding, I must consider not merely as useless, but as positively noxious.

□□□

To sum up what I have said: I think it clear that we are not fettered by the Act of Parliament of 1813; that we are not fettered by any pledge expressed or implied; that we are free to employ our funds as we choose; that we ought to employ them in teaching what is best worth knowing; that English is better worth knowing than Sanscrit or Arabic; that the natives are desirous to be taught English, and we are not desirous to be taught Sanscrit or Arabic; that neither as the languages of law, nor as the languages of religion, have Sanscrit and Arabic any peculiar claim to our encouragement; that it is possible to make natives of this country thoroughly good English scholars, and that to this end our efforts ought to be directed.

In one point I fully agree with the gentlemen to whose general views I am opposed. I feel, with them, that it is impossible for us, with our limited means, to attempt to educate the body of people. We must at present do our best to form a class who may be interpreters between us and the millions whom we govern; a class of persons, Indian in blood and colour, but English in taste, in opinions, in morals, and in intellect. To that class we may leave it to refine the vernacular dialects of the country, to enrich those dialects with terms of science borrowed from the Western nomenclature, and to render them by degrees fit vehicles for conveying knowledge to the great mass of the population.

I would strictly respect all existing interests. I would deal even generously with all individuals who have had fair reason to expect a pecuniary provision. But I would strike at the root of the bad system which has hitherto been fostered by us. I would at once stop the printing of Arabic and Sanscrit books; I would abolish the Madrassa and the Sanscrit college at Calcutta. Benares is the great seat of Brahmanical learning; Delhi, of Arabic learning. If we retain the Sanscrit college at Benares and the Mahomedan college at Delhi, we do enough, and much more than enough in my opinion, for the Eastern languages. If the Benares and Delhi colleges should be retained, I would at least recommend that no stipend shall be given to any students who may hereafter repair thither, but that people shall be left to make their own choice between the rival systems of education without being bribed by us to learn what they have no desire to know. The funds which would thus be placed at our disposal would enable us to give larger encouragement to the Hindoo college at Calcut-

which ought, as we all agree, to be sacredly preserved. It is confessed that a language is barren of useful knowledge. We are told to teach it because it is fruitful of monstrous superstitions. We are to teach false history, false astronomy, false medicine, because we find them in company with a false religion. We abstain, and I trust shall always abstain, from giving any public encouragement to those who are engaged in the work of converting natives to Christianity. And, while we act thus, can we reasonably and decently bribe men out of the revenues of the state to waste their youth in learning how they are to purify themselves after touching an ass, or what text of the Vedas they are to repeat to expiate the crime of killing a goat?

It is taken for granted by the advocates of Oriental learning that no native of this country can possibly attain more than a mere smattering of English. They do not attempt to prove this; but they perpetually insinuate it. They designate the education which their opponents recommend as a mere spelling-book education. They assume it is undeniable, that the question is between a profound knowledge of Hindoo and Arabian literature and science on the one side, and a superficial knowledge of the rudiments of English on the other. This is not merely an assumption, but an assumption contrary to all reason and experience. We know that foreigners of all nations do learn our language sufficiently to have access to all the most abstruse knowledge which it contains, sufficiently to relish even the more delicate graces of our most idiomatic writers. There are in this very town natives who are quite competent to discuss political or scientific questions with fluency and precision in the English language. I have heard the very question on which I am writing discussed by native gentlemen with a liberality and an intelligence which would do credit to any member of the committee of public instruction. Indeed, it is unusual to find, even in literary circles of the continent, any foreigner who can express himself in English with so much facility and correctness as we find in many Hindoos. Nobody, I suppose, will contend that English is so difficult to a Hindoo as Greek to an Englishman. Yet an intelligent English youth, in a much smaller number of years than our unfortunate pupils pass at the Sanscrit College, becomes able to read, to enjoy, and even to imitate, not unhappily, the composition of the best Greek authors. Less than half the time which enables an English youth to read Herodotus and Sophocles ought to enable a Hindoo to read Hume and Milton.

feeling of the native public, when left to itself, is not such as the supporters of the old system represent it to be. The Committee have thought fit to lay out above a lac of rupees in printing Arabic and Sanscrit books. Those books find no purchasers. It is very rarely that a single copy is disposed of. Twenty-three thousand volumes, most of them folios and quartos, fill the libraries, or rather the lumber-rooms, of this body. The Committee contrive to get rid of some portion of their vast stock of Oriental literature by giving books away. But they cannot give so fast as they print. About twenty thousand rupees a year are spent in adding fresh masses of waste paper to a hoard which, I should think, is already sufficiently ample. During the last three years, about sixty thousand rupees have been expended in this manner. The sale of Arabic and Sanscrit books, during those years, has not yielded quite one thousand rupees. In the mean time the school book society is selling seven or eight thousand volumes every year, and not only pays the expenses of printing, but realizes a profit of 20 per cent on its outlay.

The fact that the Hindoo law is to be learned chiefly from Sanscrit books, and the Mahomedan law from Arabic books, has been much insisted on, but seems not to bear at all on the question. We are commanded by Parliament to ascertain and digest the laws of India. The assistance of a law commission has been given to us for that purpose. As soon as the code is promulgated, the Shasters and Hedeya will be useless to a Moonsiff or Sudder Ameen. I hope and trust that, before the boys who are now entering at the Madrassa and the Sanscrit college have completed their studies, this great work will be finished. It would be manifestly absurd to educate the rising generation with a view to a state of things which we mean to alter before they reach manhood.

But there is yet another argument which seems even more untenable. It is said that the Sanscrit and Arabic are the languages in which the sacred books of a hundred millions of people are written, and that they are, on that account, entitled to particular encouragement. Assuredly it is the duty of the British Government in India to be not only tolerant, but neutral on all religious questions. But to encourage the study of a literature admitted to be of small intrinsic value only because that literature inculcates the most serious errors on the most important subjects, is a course hardly reconcilable with reason, with morality, or even with that neutrality

the supposition that some loss had been satisfied—that some wrong had been inflicted. These are surely the first petitioners who ever demanded compensation for having been educated gratis—for having been supported by the public during the twelve years, and then sent forth into the world well-furnished with literature and science. They represent their education as an injury which gives them a claim on the Government for redress, as an injury for which the stipends paid to them during the infliction were a very inadequate compensation. And I doubt not that they are in the right. They have wasted the best years of life in learning what procures for them neither bread nor respect. Surely we might, with advantage, have saved the cost of making these persons useless and miserable; surely, men may be brought up to be burdens to the public and objects of contempt to their neighbors at a somewhat smaller charge to the state. But such is our policy. We do not even stand neuter in the contest between the truth and falsehood. We are not content to leave the natives to the influence of their own hereditary prejudices. To the natural difficulties which obstruct the progress of sound science in the East we add fresh difficulties of our own making. Bounties and premiums, such as ought not to be given even for the propagation of truth, we lavish on false taste and false philosophy.

By acting thus we create the very evil which we fear. We are making that opposition which we do not find. What we spend on the Arabic and Sanscrit colleges is not merely a dead loss to the cause of truth: it is the bounty-money paid to raise up champions of error. It goes to form a nest, not merely of helpless place-hunters, but of bigots prompted alike by passion and by interest to raise a cry against every useful scheme of education. If there should be any opposition among the natives to the change which I recommend, that opposition will be the effect of our own system. It will be headed by persons supported by our stipends and trained in our colleges. The longer we persevere in our present course, the more formidable will that opposition be. It will be every year re-inforced by recruits whom we are paying. From the native society left to itself we have no difficulties to apprehend; all the murmuring will come from that Oriental interest which we have, by artificial means, called into being and nursed into strength.

There is yet another fact, which is alone sufficient to prove that the

andJulylast,103rupees.

I have been told that it is merely from want of local experience that I am surprised at these phenomena, and that it is not the fashion for students in India to study at their own charges. This only confirms me in my opinion. Nothing is more certain than that it never can in any part of the world be necessary to pay men for doing what they think pleasant and profitable. India is no exception to this rule. The people of India do not require to be paid for eating rice when they are hungry, or for wearing woolen cloth in the cold season. To come nearer to the case before us, the children who learn their letters and little elementary Arithmetic from the village schoolmaster are not paid by him. He is paid for teaching them. Why, then, is it necessary to pay people to learn Sanscrit and Arabic? Evidently because it is universally felt that Sanscrit and Arabic are languages the knowledge of which does not compensate for the trouble of acquiring them. On all such subjects the state of market is the decisive test.

Other evidence is not wanting, if other evidence were required. A petition was presented last year to the committee by several ex-students of the Sanscrit College. The petitioners stated they had studied in the college ten or twelve years; that they had made themselves acquainted with Hindoo literature and science; that they had received certificates of proficiency: and what is the fruit of all this? "Notwithstanding such testimonials," they say, "we have little prospect of bettering our condition without the kind assistance of your honorable committee, the indifference with which we are generally looked upon by our countrymen leaving no hope of encouragement and assistance from them." They therefore beg that they may be recommended to the Governor General for places under the government, not places of high dignity or emolument, but such as may just enable them to exist. "We want means," they say, "for a decent living, and for our progressive improvement, which, however, we cannot obtain without the assistance of Government, by whom we have been educated and maintained from childhood." They conclude by representing, very pathetically, that they are sure that it was never the intention of Government, after behaving so liberally to them during their education, to abandon them to destitution and neglect.

I have been used to see petitions to Government for compensation. All these petitions, even the most unreasonable of them, proceeded on

national prejudices; not by feeding the mind of the young Muscovite with the old woman's stories which his rude fathers had believed: not by filling his head with lying legends about St. Nicholas: not by encouraging him to study the great question, whether the world was or was not created on the 13th of September: not by calling him "a learned native," when he has mastered all these points of knowledge: but by teaching him those foreign languages in which the greatest mass of information had been laid up, and thus putting all that information within his reach. The languages of Western Europe civilized Russia, I cannot doubt that they will do for the Hindoo what they have done for the Tartar.

And what are the arguments against that course which seems to be alike recommended by theory and by experience? It is said that we ought to secure the cooperation of the native public, and that we can do this only by teaching Sanscrit and Arabic.

I can by no means admit that, when a nation of high intellectual attainments undertakes to superintend the education of a nation comparatively ignorant, the learners are absolutely to prescribe the course which is to be taken by the teacher. It is not necessary, however, to say anything in this subject. For it is proved by unanswerable evidence that we are not at present securing the cooperation of natives. It would be bad enough to consult their intellectual taste at the expense of their intellectual health. But we are consulting neither—we are withholding from them the learning which they are craving; we are forcing on them the mock-learning which they nauseate.

This is proved by the fact that we are forced to pay our Arabic and Sancrit students, while those who learn English are willing to pay us. All the declamations in the world about the love and reverence of the natives for their sacred dialects will never, in the mind of any impartial person, outweigh the undisputed fact, that we cannot find, in all our vast empire, a single student who will let us teach those dialects unless we will pay him.

I have now before me the accounts of the Madrassa for one month—the month of December, 1833. The Arabic students appear to have been seventy-seven in number. All receive stipends from the public. The whole amount paid to them is above 500 rupees a month. On the other side of the account stands the following item: Deduct amount realized from the out-students of English for the months of May, June,

boarding school—History, abounding with kings thirty feet high, and reigns thirty thousand years long—and Geography, made up of seas of treacle and seas of butter.

We are not without experience to guide us. History furnishes several analogous cases, and they all teach the same lesson. There are in modern times, to go no further, two memorable instances of a great impulse given to the mind of the whole society—of prejudices overthrown—of knowledge diffused—of taste purified—of arts and sciences planted in countries which had recently been ignorant and barbarous.

The first instance to which I refer is the great revival of letters among the Western nations at the close of fifteenth and the beginning of the sixteenth century. At that time everything that was worth reading was contained in the writings of the ancient Greeks and Romans. Had our ancestors acted as the committee of Public Instruction has hitherto acted; had they neglected the language of Cicero and Tacitus; had they confined their attention to the old dialects of our own island; had they printed nothing and taught nothing at universities but chronicles in Anglo-Saxon and romances in Norman-French, would England have been what she now is? What the Greek and Latin were to contemporaries of More and Ascham, our tongue is to the people of India. The literature of England is now more valuable than that of classical antiquity. I doubt whether the Sanscrit literature be as valuable as that of our Saxon and Norman progenitors. In some departments—in History, for example—I am certain that it is much less so.

Another instance may be said to be still before our eyes. Within the last hundred and twenty years, a nation which had been previously in a state as barbarous as that in which our ancestors were before the Crusades, has gradually emerged from the ignorance in which it was sunk, and has taken its place among civilized communities—I speak of Russia. There is now in that country a large educated class, abounding with persons fit to serve the state in highest functions, and nowise inferior to the most accomplished men who adorn the best circles of Paris and London. There is reason to hope that this vast empire, which in the time of our grandfathers was probably behind the Punjab, may, in the time of our grandchildren, be pressing close on France and Britain in the career of improvement. And how was this change effected? Not by flattering

is hardly necessary to recapitulate. It stands preeminent even among the languages of the West. It abounds with the works of imagination not inferior to the noblest which Greece has bequeathed to us; with models of every species of eloquence; with historical compositions, which, considered merely as narratives, have seldom been surpassed, and which, considered as vehicles of ethical and political instruction, have never been equaled; with just and lively presentations of human life and human nature; with the most profound speculations on metaphysics, morals, government, jurisprudence, and trade; with full and correct information respecting every experimental science which tends to preserve the health, to increase the comfort, or to expand the intellect of man. Whoever knows that language, has ready access to all the vast intellectual wealth, which all the wisest nations of the earth have created and hoarded in the course of ninety generations. It may safely be said that the literature now extant in that language is of far greater value than all the literature which three hundred years ago was extant in all languages of the world together. Nor is this all. In India, English is the language spoken by ruling class. It is spoken by the higher class of natives at the seats of Government. It is likely to become the language of commerce throughout the seas of the East. It is the language of two great European communities which are rising, the one in the south of Africa, the other in Australasia; communities which are every year becoming more important, and more closely connected with our Indian empire. Whether we look at the intrinsic value of our literature, or at the particular situation of this country we shall see the strongest reason to think that, of all foreign tongues, the English tongue is that which would be the most useful to our native subjects.

The question now before us is simply whether, when it is our power to teach this language, we shall teach languages in which, by universal confession, there are no books on any subject which deserve to be compared to our own; whether, when we can teach European sciences, we shall teach systems which, by universal confession whenever they differ from those of Europe, differ for the worse; and whether when we can patronize sound philosophy and true History, we shall countenance, at the public expense, medical doctrines which would disgrace an English Farrier—Astronomy, which would move laughter in girls at English

literacy nor scientific information, and are, moreover so poor and rude that, until they are enriched from some other quarter. It will not be easy to translate in any valuable work into them. It seems to be admitted on all sides that the intellectual improvement of those classes of the people who have means of pursuing higher studies can at present be effected only by some language not vernacular amongst them.

What, then, shall that language be? One half of the committee maintain that it should be the English. The other half strongly recommend the Arabic and Sanscrit. The whole question seems to me to be, which language is the best worth knowing?

I have no knowledge of either Sanscrit or Arabic.—But I have done what I could to form a correct estimate of their value. I have read translations of the most celebrated Arabic and Sanscrit works. I have conversed both here and at home with men distinguished by the proficiency in the Eastern tongues. I am quite ready to take the Oriental learning at the valuation of the Orientalists themselves. I have never found one among them who could deny that a single shelf of a good European library was worth the whole native literature of India and Arabia. The intrinsic superiority of western literature is, indeed, fully admitted by those members of the committee who support the Oriental plan of education.

It will hardly be disputed, I suppose, that the department of literature in which the Eastern writers stand highest is poetry. And I certainly never met with any Orientalist who ventured to maintain that the Arabic and Sanscrit poetry could be compared to that of the great European nations, But, when we pass from works of imagination to works in which facts are recorded and general principles investigated, the superiority of Europeans become absolutely immeasurable. It is, I believe, no exaggeration to say, that all the historical information which has been collected from all the books written in the Sanscrit language is less valuable than what may be found in the most paltry abridgements used at preparatory schools in England. In every branch of physical or moral philosophy the relative position of the two nations is nearly the same.

How, then, stands the case? We have to educate a people who cannot at present be educated by means of their mother-tongue. We must teach them some foreign language. The claims of our own language it

person a formal assurance; nay, if the Government has excited in any person's mind a reasonable expectation that he shall receive a certain income as a teacher or learner of Sanscrit or Arabic, I would respect that person's pecuniary interests---I would rather err on the side of liberality to individuals than suffer the public faith to be called in question. But to talk of a Government pledging itself to teach certain languages and certain sciences, though those languages may become useless, though those sciences may be exploded, seems to me quite unmeaning. There is not a single word in any public instructions from which it can be inferred that the Indian Government ever intended to give any pledge on this subject, or ever considered the destination of these funds as unalterably fixed. But, had it been otherwise, I should have denied the competence of our predecessors to bind us by any pledge on such a subject. Suppose that a Government has in the last century enacted in the most solemn manner that all its subjects should, to the end of time, be inoculated for the small-pox: Would that Government be bound to persist in the practice after Jenner's discovery? These promises, of which nobody claims the performances, and from which nobody can grant a release; these vested rights, which vests in nobody; this property without proprietors; this robbery, which makes nobody poorer, may be comprehended by persons of higher faculties than mine--I consider this plea merely as a set form of words, regularly used both in England and India, in defence of every abuse for which no other plea can be set up.

I hold this lac of rupees to be quite at the disposal of the Governor-General in Council, for the purpose of promoting learning in India, in any way which may be thought most advisable. I hold this Lordship to be quite as free to direct that it shall no longer be employed in encouraging Arabic and Sancrit, as he is to direct that the reward for killing tigers in Mysore shall be diminished, or that no more public money shall be expended on the chanting at the cathedral.

We now come to the gist of the matter. We have a fund to be employed as Government shall direct for the intellectual improvement of the people of this country. The simple question is, what is the most useful way of employing it?

All the parties seem to be agreed on this point, that the dialects commonly spoken among the natives of this part of India contain neither

onions were anciently adored? Would he be justly charged with inconsistency, if, instead of employing his young subjects in deciphering obelisks, he were to order them to be instructed in the English and French languages, and in all the sciences to which those languages are the chief keys?

The words on which the supporters of the old system rely do not bear them out, and other words follow which seem to be quite decisive on the other side. This lac of rupees is set apart, not only for "reviving literature in India," the phrase on which their whole interpretation is founded, but also for "the introduction and promotion of a knowledge of the sciences among the inhabitants of the British territories,"---words which are alone sufficient to authorize all the changes for which I contend.

If the Council agree in my construction, no legislative Act will be necessary. If they differ from me, I will prepare a short Act rescinding that clause of the charter of 1813, from which the difficulty arises.

The argument which I have been considering affects only the form of proceeding. But the admirers of the Oriental system of education have used another argument, which, if we admit it to be valid, is decisive against all change. They conceive that the public faith is pledged to the present system, and that to alter the appropriation of any of the funds which have hitherto been spent in encouraging the study of Arabic and Sanscrit would be downright spoliation. It is not easy to understand by what process of reasoning they can have arrived at this conclusion. The grants which are made from the public purse for the encouragement of literature differed in no respect from the grants which are made from the same purse for other objects of real or supposed utility. We found a sanatarium on a spot which we suppose to be healthy. Do we thereby pledge ourselves to keep a sanatarium there, if the result should not answer our expectation? We commence the erection of a pier. Is it a violation of public faith to stop the works, if we afterwards see reason to believe that the building will be useless? The rights of property are undoubtedly sacred. But nothing endangers those rights as much as the practice, now unhappily too common, of attributing them to things to which they do not belong. Those who would impart to abuses the sanctity of property are in truth imparting to the institution of property the unpopularity and fragility of abuses. If the government has given to any

Minute on Indian Education

Thomas Babington Macaulay

As it seems to be the opinion of some of the gentlemen who compose the committee of Public Instruction, that the course which they have hitherto pursued was strictly prescribed by the British Parliament in 1813, and as, if that opinion be correct, a legislative act will be necessary to warrant a change, I have thought it right to refrain from taking any part in preparation of the adverse statements which are now before us, and to reserve what I had to say on the subject till it should come before me as a member of the council of India.

It does not appear to me that the Act of Parliament can, by any art of construction, be made to bear the meaning which has been assigned to it. It contains nothing about the particular languages or sciences which are to be studied. A sum is set apart "for the revival and promotion of literature and the encouragement of the learned natives of India, and for the introduction and promotion of a knowledge of the sciences among the inhabitants of the British territories." It is argued, or rather taken for granted, that by literature the Parliament can have only meant Arabic and Sanscrit literature, that they never would have given the honorable appellation of a "learned native" to a native who was familiar with the poetry of Milton, the metaphysics of Locke, the physics of Newton; but that they meant to designate by that name only such persons as might have studied in the sacred books of the Hindoos all the usages of cusa-grass, and all the mysteries of absorption into the Deity. This does not appear to be a very satisfactory interpretation. To take a parallel case; suppose that the Pacha of Egypt, a country once superior in knowledge to the nations of Europe, but now sunk far below them, were to appropriate a sum for the purpose of "reviving and promoting literature, and encourage learned natives of Egypt." Would anybody infer that he meant the youth of his pachalic to give years to the study of hieroglyphics, to search into all the doctrines disguised under the fable of Osiris, and to ascertain with all possible accuracy the ritual with which cats and

تہذیبوں کی تفہیم انسانی عقل و دانش کا نہ صرف
خاصہ ہے بلکہ اس کے تغیرات، خدوخال، اس کے بنیادی
ماخذ کو جاننا اور اسے موازناتی پیمانے پر پرکھنا ہی قوموں کی
فکری جہتوں اور ترقی کی راہوں کو متعین کرتا ہے زیرِ نظر
کتابچہ مغربی طرزِ فکر اور تعلیمی نقطہ ہائے نظر کو جذباتی
پیمانوں پر جانچنے کی بجائے عقل و فہم کی کسوٹی پر پرکھنے کی
ایک کوشش ہے جس سے قاری نظامِ تعلیم کی خامیوں اور
اس سے پیدا ہونے والے فکری و تعلیمی بحران کو واضح طور
پر محسوس کر سکیں گے۔ اُمید ہے اس سلسلے کے رواں رہنے
سے مغرب کے افکار کو سمجھنے میں کافی حد تک مدد ملے گی۔

کتاب محل دربار مارکیٹ لاہور
0321-8836932
Rs: 70/-